ڈاکٹر نجیبہ عارف

استاد شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

انیسویں صدی کا ایک نادر تذکرہ: منتخب متن و تحشیہ

Dr. Najeeba Arif

Head Department of Urdu, International Islamic University Islamabad.

SELECT TEXT OF A RARE MANUSCRIPT OF THE NINETEENTH CENTURY: NOTES AND ANNOTATIONS

This article includes the edited text of the first chapter of a rare unpublished manuscript of the nineteenth century. The manuscript is a collection of biographical notes of the Urdu poets of Lucknow written by Abdul Ghafūr Nassākh, a well-known scholar and poet of his time. It lies in the Bodleian library Oxford, UK. The whole work includes 12chapters in total and in each chapter, the biographies of a master poet and his pupils have been given. The first chapter is about the renowned poet Mushafī and his pupils, including Insha, Khalīq, Shahīdī, Zamīr, Zarīf, Āqil, Maujī, Havas and Garm. The text of the manuscript has been edited and given in the contemporary script and spelling. Notes and annotations have also been added to the text along with a brief introduction.

Key words: *Biographical, Manuscript, Contemporary, Annotations.*

انیسویں صدی کا لکھنؤ اردو ادب اور علم و فن کے ارتقا کا اہم سنگ میل ہے۔ اس عہد میں نہ صرف شاعری، موسیقی اور رقص کے فنون نے سماجی زندگی میں مرکزی اہمیت حاصل کر لی تھی بلکہ دیگر کئی علوم، کھیل اور مشاغل بھی لکھنؤ کی معاشرت کا لازمی جزو بن گئے تھے۔ اس عہد کی سیاسی و سماجی تاریخ آج بھی محققین اور ادب و سماجیات کے طالب علموں کے لیے علمی و تحقیق دلچسپی کا سامان ہے۔ اس کے پیشِ نظر ذیل میں انیسویں صدی کے ایک نادر تذکرے کا عکس اور جدید املا میں متن کا کچھ حصہ (پہلا باب) پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تذکرہ راقم الحروف کو بوڈلئن لائبریری، اوکسفرڈ میں ملا۔ بڑے سائز

کے ۹۴اوراق (۱۸۸صفحات) پر مشتمل یہ تذکرہ اگرچہ مصنف کے نام اور کسی بھی عنوان سے محروم ہے لیکن متن کی داخلی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلکتہ کے معروف شاعر اور تذکرہ نگار عبد الغفور نساخ (۱۸۳۴۔۱۸۸۹) کی تصنیف ہے جس کا زمانۂ تصنیف ۱۸۷۲سے ۱۸۸۷ کے درمیان کا ہے۔نساخ کی اس تصنیف کا ذکر ان کی اپنی کسی تحریر میں ملتا ہے نہ ان کی خود نوشت میں کوئی ایسا اشارہ موجود ہے جو اس تذکرے کے زمانۂ تصنیف یا اس کے ارادے کو ظاہر کرے۔نساخ پر لکھی جانے والی کتب اور مقالات بھی اس تذکرے کے ذکر سے خالی ہیں۔اس اعتبار سے یہ ایک نادر قلمی نسخہ ہے جس کی کسی اور نقل کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔

اس تذکرے میں لکھنؤ کے اساتذہ شعرا اور ان کے شاگردوں کا مفصل حال درج کیا گیا ہے۔تذکرے کا آغاز فہرست ابواب سے ہوتا ہے اور اسی سے تذکرے کی اہمیت اور نوعیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔کل بارہ ابواب پر مشتمل یہ فہرست ذیل میں نقل کی جا رہی ہے۔

باب اول :استاد مصحفی اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

مصحفی۔انشا۔خلیق۔شہیدی۔ضمیر۔ظریف۔عاقل۔موجی۔ہوس۔گرم۔

باب دوم :استاد آتش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

آتش۔اصغر۔افضل۔بسمل۔خلیل۔رند۔سرور۔شرر۔شرف۔منتہی۔

باب سوم :استاد صبا اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

صبا۔ریحان۔ازل۔کیف۔ہنر۔

باب چہارم :استاد ناسخ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

ناسخ۔آباد۔آشنا۔بحر۔ثاقب۔رشک۔آرزو۔شائق۔شہید۔صحبت۔عرش۔احق قبول۔کیوان۔مسیحا۔

باب پنجم :استاد برق اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

برق۔تسخیر۔احسن۔اشک۔خورشید۔

باب ششم :استاد وزیر اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

وزیر۔خلق۔گویا۔محسن۔تقی۔قلق۔

باب ہفتم :شاعران ریختی گو کے بیان میں

عاشور۔جان صاحب۔خلیل اسحاق۔رنگین۔مخلوق۔نسبت۔

باب ہشتم :استاد سرب سنگھ اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

سرب سنگھ۔ پروانہ۔ حسرت۔ جرات۔ قیس۔ حقیقت۔

باب نہم :استاد نوازش اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

نوازش۔ سرور۔ دلگیر۔ امانت۔

باب دہم :استاد طوطارام اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

طوطارام۔ زار یعنی میڈولال۔ شوق۔ مقبول۔

باب یازدہم :شاعران مرثیہ گو کے بیان میں

دبیر۔ انیس۔

باب دوازدہم :شاعران متفرق کے بیان میں

جوش۔ آصف۔ رحمت۔ عباس۔ اختر واجد علی شاہ۔ ذکی۔ مونس۔ سوز۔ فریاد۔ بقا۔ اختر و فخر، شاگردان مرزا قتیل۔ انور علی۔ ادراک۔ فخر۔ اشرف۔

اس تذکرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شعرا کی نجی اور سماجی زندگی کے کئی گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ مفصل حالات کی بنا پر یہ اپنے عہد کی سیاسی و سماجی تاریخ کا اہم جزو پیش کرتا ہے اور دیگر تذکروں کی نسبت نمایاں اور منفرد قرار دیا جاسکتا ہے۔[1] نیز اس کی ترتیب عمومی تذکروں سے قدرے مختلف ہے یعنی اس میں شعرا کا ذکر الف بائی ترتیب سے کرنے کے بجاے اساتذہ اور ان کے تلامذہ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ہر باب میں کسی ایک استاد شاعر کے تلامذہ کا بیان ملتا ہے۔

اس تذکرے کا مکمل متن زیر ترتیب ہے۔ ذیل میں اس تذکرے کے پہلے باب کا متن رائج املا میں پیش کیا جارہا ہے۔ متن کی تدوین کے لیے درج ذیل اصول پیش نظر رکھے گئے ہیں:

- متن کو رائج املا میں درج کیا گیا ہے۔
- ہجوں کی اغلاط درست کر دی گئی ہیں۔
- ۱۳اگر کوئی لفظ پڑھا نہیں جا سکا یا جملے کی ترتیب میں سہو پایا گیا تو خطوط وحدانی میں "کذا" یا "؟" کی علامت دی گئی ہے۔
- جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں مختصر حواشی درج کر دیے گئے ہیں۔
- امالہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- کہیں سہواً الفاظ کی تکرار ہے تو مکرر لفظ کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسے انشا کے تذکرے میں "ان کی ان کی ہجو خوانی۔۔۔" تحریر ہے۔ یہاں سے زائد الفاظ حذف کر دیے ہیں۔
- جہاں جملوں میں ربط کی کمی محسوس ہوئی وہاں [] میں حروف ربط یا کسی مجوزہ لفظ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

- رموزِ اوقاف لگائے گئے ہیں اور متن کو اقتباسات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

تذکرۂ شعراے لکھنؤ

باب اول: استاد مصحفی اور اس کے شاگردوں کے بیان میں

مصحفی:

تخلص مصحفیؔ، شیخ غلام ہمدانی، ولد شیخ ولی محمد، شاگرد مانی، باشندۂ قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد۔ اپنی شروع جوانی میں دہلی گئے تھے۔ آخر الامر وہاں کی فضا ایسی مرغوبِ دل ہوئی کہ جا کر اپنی تمام عمر لکھنؤ میں بسر کی۔ کچھ دنوں مرزا سلیمان شکوہ بہادر کی رفاقت میں تھے۔ جمیع سخن پر قادر تھے۔ اور پر گو تھے۔ مرزا رفیع السودا کے زمانے میں ان کی ابتدا تھی۔ جرأت اور میر انشأاللہ خان مصاحبِ خاص نواب سعادت خان امین الدولہ بہادر کے ساتھ مشاعرے اکثر کیے تھے۔ اس قدر یہ نامی شاعر بن گئے کہ تمام ملک ہندستان ان سے اور ان کے کلام سے واقف ہے۔ کون سی جا ہے کہ جہاں ان کا ذکر نہیں ہوتا اور کون [سا] مشاعرہ ہے کہ ان کی غزل نہیں پڑھی جاتی ہے۔

آخر کو یہ نوبت ہوئی کہ میر [انشأ] اللہ خان نے ان کی ہجو کی اور میاں مصحفیؔ نے انشأاللہ خان کی ہجو کی اور ایک دن اس کے پڑھنے کا مقرر ہوا۔ تمام شہر کو اشتیاق تھا۔ میر انشأاللہ خان صاحب نے ہر کوچہ بازار میں اشتہار لگا دیے کہ جس شخص کو سننا ہو، خان صاحب بہادر کے مکان پر آئے، بعد دوپہر کے جلسہ ہوگا۔ دن مقرر جب آیا، ہر ایک آدمی اپنے مکان سے دو گھڑی پیشتر چل نکلا۔ چند عرصے کے بعد غل ہوا کہ میاں مصحفی، مع شاگردان اور صدہا آدمی کا مجمع ساتھ ہے، اور ڈنڈے بجتے چلے آتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج روز ہولی [ہے]۔ جب مکان پر میر انشأاللہ خان کے پہنچے، میر صاحب اپنے مکان سے دیوان خانے میں آئے اور میاں مصحفی کو نہایت اس دن خوشی حاصل تھی۔ میر انشأاللہ خان اپنے دیوان خانے میں آئے۔ ان سب صاحبوں کو بٹھایا اور ہر ایک طرح کی خاطر سے پیش آئے۔ آخرش، شائق جو لوگ اس کلام کے ہو کے آئے، انھیں نے میاں مصحفی سے یہ بات عرض کی، اب آپ کو کس کا انتظار ہے۔ میاں صاحب نے فرمایا کہ میر انشأاللہ خان سے دریافت فرمایئے، جب وہ ارشاد کریں گے اس وقت ہم شروع کریں۔ ہم کو کچھ پڑھنے میں کسی طرح کا انکار نہیں ہے۔ لوگوں [نے] جا کر میر انشأاللہ خان سے عرض کیا، کیا عرصے کا باعث ہے۔ یہ بات سن کے میر انشأاللہ خان خود صحبت میں جا کر بیٹھے اور کہا کہ میاں مصحفی! بسم اللہ! یہ کلمہ وہ سن کے ہجو پڑھنے لگے۔ ”بلور کی گردن اور انگور کی گردن“ خان صاحب مذکور بھی خود ہر شعر پر تعریف کرتے تھے اور لوگ تمام ہنستے ہنستے بے تاب ہو گئے تھے۔ اس طرح کا جلسہ کہیں شہر میں نہیں ہوا تھا۔ پہر بھر شعر خوانی رہی؛ بعد اس کے وہ مکان پر تشریف لے گئے۔ انشأاللہ خان صاحب کے شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ کوئی ہجو میاں مصحفی کی شان میں ارشاد فرمائیں اور آپ بھی اسی انداز سے ان کے مکان پر چلیے تاکہ ان کی ہجو کہنے کا مزا یاد رہے۔ خان صاحب نے کہا کہ بہت خوب۔

دس پندرہ روز کے زمانے میں خان صاحب نے میاں مصحفی کی ہجو نہایت عمدہ لکھی اور اپنے چلنے کا دن میاں مصحفی کے مکان پر مقرر کیا۔ اسی طرح تمام شہر کو خبر دی کہ فلاں روز میر انشاؑاللہ خان ہجو پڑھتے ہوئے میاں مصحفی کے مکان پر جائیں گے۔ یہ سن کے ہزار ہا آدمی ان کے ساتھ تھا۔ غرض میاں مصحفی کے گھر پر جا پہنچے۔ میاں صاحب نے اسی طرح ان صاحبوں کی خاطر کی اور حکم دیا کہ ہجو پڑھیے۔ یہ سن کے میر انشاؑاللہ خان صاحب نے مع شاگردوں بہ آواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ بہت لوگ خوش ہوئے اور بعض بعض ناراض ہوئے۔ اسی صورت پر ایک پہر صحبت رہی۔ پھر برخاست ہوئی۔ ہر کارے جو سلطانی وہاں مقرر تھے، نواب صاحب کو اس مضمون کا پرچہ لکھا کہ نواب صاحب اس پرچے کو پڑھ کر نہایت ناراض ہوئے اور مصحفی کے بارے میں حکم ہوا کہ ابھی اس کو ہمارے شہر سے نکال دو۔ انشاؑاللہ خان نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ خانہ زاد بھی میاں مصحفی کے ہمراہ جائے گا۔ یہ سن کے نواب نے حکم موقوف رکھا۔ میر انشاؑاللہ خان کے تو شاگرد میاں مصحفی کی ہجو ہر گلی کوچہ و بازار میں پڑھتے تھے۔ میاں مصحفی جو ہجو میر انشاؑاللہ خان کی کہتے تھے، کوئی شاگرد مارے خوف کے پڑھ نہ سکتا تھا۔ اس غم میں میاں مصحفی بیمار ہوئے اور مارے ندامت کے مکان سے باہر نہ آتے تھے۔ جو شخص ملاقات کو ان کے پاس آتے، کبھی میاں صاحب اپنا حال لکھ کے بیان کرتے تھے۔ وہ پڑھ کے نہایت رنج کرتا تھا۔ میر انشاؑاللہ خان کا زمانہ تھا۔ کچھ زور کسی کا نہ [چل] سکتا تھا۔ بجز خموشی اور نہ کوئی [کسی] امر [میں] دخل دیتے تھے۔ [۲]

ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہے؛ چھے دیوان زبان اردو میں ہیں اور تذکرہ فارسی میں، دو دیوان اور ایک تذکرہ اور بہت سے آدمی اُن کے شاگرد ہیں اور صدہا لوگوں نے ان سے علم عروض اور فن شاعری حاصل کیا ہے۔ آخرش اسی بیماری میں انتقال کیا ۱۲۴۰ ہجری [۱۸۲۴۔۲۵] میں۔ مرد نہایت نیک بخت تھے اور مرد صالح تھے۔ شعر نہایت عاشقانہ فرماتے تھے اور درویش کامل مشہور تھے۔

غزل:۱

دیکھنا کیسا کہ واں تک دیر جانا منع ہے
روزن دیوار سے آنکھیں لڑانا منع ہے
مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب دانہ منع ہے
رحم کر بہر خدا ! مت کاٹ نخل بوستاں
آشیاں بلبل کا ان روزوں جلانا منع ہے
قصد کر کے روز جس کو دیکھنے جاتے تھے ہم
وائے رسوائی اسی در بھی جانا منع ہے

جب مرے ہم، اہل مجلس سے تب اس نے یہ کہا
اب ہمیں چالیس دن مہندی لگانا منع ہے
بیٹھ کر بالیں پہ میری رو نہ تو اے رشک شمع
سامنے بیمار کے آنسو بہانا منع ہے
سادگی پر جس کے دم نکلے ہے اپنا مصحفی
ہائے اب تک اس کو مسی کا لگا نا منع ہے[۳]

فقط۔

انشا:

انشا تخلص، انشاءاللہ خان، شاگرد اپنے باپ کے تھے، ولد مخیر الدولہ بہادر، باشندۂ نجف اشرف، طبیب شاہجہاں فرخ سیر بادشاہ۔ ہمراہ انشاءاللہ خان پدر بزرگوار کے، شاہجہاں آباد میں آئے تھے۔ محلہ مغل پورہ میں، زمانے نواب آصف الدولہ کے میں، لکھنؤ میں مع اولاد تشریف لائے۔ ہمہ گو وہمہ دان، شیریں زبان، بلبل ہندوستان مشہور ہیں۔ پسر ان کے سید ماشاءاللہ خان بہادر اسد جنگ۔ نواب سعادت علی خان بہادر کے زمانہ میں انشاءاللہ خان نواب مذکور کے مصاحب خاص ہوئے اور ان کو اختیار ہر طرح کا اس سلطنت میں تھا۔ مصحفی کے ہم عصر تھے۔ اکثر ان کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوتے تھے۔ بعد تھوڑے عرصے کے یہ کیفیت ہوئی، ان کی ہجو خوانی ہونے لگی۔ انشاءاللہ خان کے تو شاگرد مصحفی کی ہجو تمام شہر میں پڑھتے تھے، مصحفی کے شاگرد مارے خوف کے میر انشاءاللہ خان کی ہجو نہ پڑھتے تھے۔ اس بات کا رنج مصحفی کو رات دن رہتا تھا۔ مارے شرم کے تین تین روز مکان سے نہ نکلتے تھے اور مشاعرے کا جانا چھوڑ دیا تھا۔[۴] ایک دن کا ذکر ہے کہ انشاءاللہ خان نے نواب صاحب سے عرض کی کہ حضور میں نے آج پلپلا پتھر ایک مقام پر دیکھا ہے۔ نواب مذکور یہ بات سن کر نہایت حیران ہوئے اور زبان مبارک سے یہ کلمہ ارشاد فرمایا کہ اگر سچ ہے تو انعام دوں گا، اگر خلاف ہے تو عتاب ہو گا۔ یہ سن کر انشاءاللہ خان مذکور نے نواب صاحب کی خدمت میں پانچ سنگترے پیش کیے اور نواب صاحب سے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور انعام کا نام کیا ہے؟ نواب صاحب نے ہنس کر بے ساختہ فرمایا ان کو سنگترے کہتے ہیں۔ انشاءاللہ خان نے کہا، جنابِ عالی پلپلا پتھر یہ ہے۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر اس دن انشاءاللہ خان کو بارہ پارچے کا خلعت عنایت فرمایا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک عالم جناب عالی کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔ انشاءاللہ خان سے گفتگو علم میں ہوتی تھی جو کچھ مولوی صاحب بھی پوچھتے تھے، میر انشاءاللہ خان جواب دیتے تھے۔ آخر خان صاحب مذکور نے مولوی صاحب سے ایک سوال کیا کہ وہ کون پیغمبر ہے کہ جس کے سر پر داڑھی ہے۔ مولوی صاحب نے دو گھڑی تک اس فکر میں گردن جھکائی۔ خموش بیٹھے رہے اور جواب یہ دیا کہ ہم کو ان کا پتہ نہیں ملتا کہ وہ کون پیغمبر ہیں اور ان کا نام کیا ہے۔ یہ خبر شدہ

شدہ نواب صاحب تک پہنچی۔ نواب صاحب نے دونوں کو پاس بلا کر ارشاد فرمایا کہ میر انشاؑاللہ تم ہی ان کا نام بتاؤ۔ خان صاحب نے عرض کی کہ حضور کا حکم ہو تو میں اس پیغمبر کو اپنے ساتھ حضور کی خدمت میں لے آؤں۔ نواب نے ارشاد کیا کہ بہتر ہے۔ انشاؑاللہ خان نے جا کر باغ میں چار ٹہنی جوار کی توڑی اور نواب صاحب کے سامنے لا کر رکھ دی اور عرض کی کہ دانیال پیغمبر ان کا نام ہے اور ڈاڑھی سر پر ان کے موجود۔[۵] عالم نے اٹھ کر خان صاحب کا بایاں قدم چوم لیا اور نواب صاحب سے فرمایا کہ آپ کی سرکار میں یہ شخص فرد ہے۔ اس دن بھی نواب صاحب نے بہت بھاری خلعت عنایت فرمایا۔

عارضۂ تپ میں انتقال کیا، زمانہ غازی الدین حیدر میں۔ آغا باقر صاحب کے امام باڑے میں دفن ہیں۔ اپنی یادگار میں سے یہ چیزیں چھوڑ گئے: صرف و نحو، منطق، علم ریاضی، زبان مصر، زبان فارس، سنسکرت زبان، مرہٹی زبان، محلات، سات دیوان، چار مثنوی، مرثیہ، سلام، دریائے لطافت، واسوخت، مناجات۔

شعر

آغوش تمنا میں جس وقت اسے مس کا
لب ہائے نزاکت سے ایک [اک]شور تھا بس بس کا[۶]

فقط۔

خلیق:

تخلص خلیق، میر مستحسن، ولد میر حسن شاگرد، خلف، سکونت فیض آباد میں۔ زمانے نواب آصف الدولہ بہادر کے، لکھنؤ میں تشریف لائے تھے، مقیم ہوئے محلہ نہری[؟][۷] میں۔ بزرگ ان کے خراسان کے رہنے والے ہیں۔ جد ان کے باشندۂ دہلی تھے۔ یہ اپنی ذات سے ہمراہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے وہاں سے چلے آئے تھے، برائے روزگار۔ اس زمانے میں میر حسن کا سن دس برس کا تھا۔ جب یہ بیس برس کے ہوئے تب ان کے والد نے انتقال کیا۔ ان کی جگہ پر میر حسن مرحوم قائم مقام ہوئے اور وہ زمانہ میر تقی کا تھا اور سودا کے اور مصحفی کے ہم عصر تھے۔ اکثر ان کے ساتھ مشاعرے میں جاتے تھے اور طرح کی غزل بھی پڑھتے تھے ان کی زبان نہایت اس زمانے میں فصیح تھی۔ ان کے آگے کسی شاعر کا رنگ نہ جمتا تھا بلکہ میر محمد تقی مرحوم بھی ان کے کلام کی تعریف کرتے تھے اور شاعری ان کے خاندان میں عرصہ پانچ سو برس کا ہوا ہے، آج تک اسی صورت پر قائم ہے۔ روز روز ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ایسی شاعری کسی خاندان میں نہیں ہے، نہ اتنے عرصے تک قیام رہا۔ کسی شاعر کی دو نسب تک، کسی کی تین نسب تک، پھر ختم ہو گئی، زیادہ نہ چل سکی۔ میاں خلیق[۸] نے اپنے دل میں یہ مشورہ کیا، ایک مثنوی نواب آصف الدولہ بہادر کے واسطے کہنا چاہیے۔ ایک قصہ بدر منیر اور بے نظیر نکال نظم کیا تھا۔ نہایت عمدہ زبان میں کہی۔ آج تک صدہا آدمی تعریف کرتے ہیں اور ہر روز عورت اور مرد مثنوی پڑھ کر آوارہ مزاج ہو گئے[۹] اور بہت سے شاعروں نے مثنوی [مثنویاں] اس کے جواب میں لکھیں مگر ایک اور کی مثنوی اس کے آگے سرسبز نہ ہوئی۔ اب تک ان کی زبان پر شاعروں کو رشک آتا ہے۔

جب مثنوی تمام ہو چکی، اس وقت نواب آصف الدولہ بہادر کے ملاحظے میں گزاری۔ نواب صاحب مرحوم [نے] حکم کیا کہ اپنی زبان سے باآواز بلند پڑھیے۔ بموجب حکم نواب صاحب کے، میر حسن مذکور نے شروع کی، جس قدر نواب صاحب کی صحبت [میں] امیر بیٹھے تھے، سب تعریف فرماتے تھے۔ اس جلسے میں میر محمد تقی مرحوم بھی موجود تھے۔ ہر شعر پر داد دیتے تھے۔ جب پڑھتے پڑھتے وہ مقام آیا کہ

اک دن دوشالہ دیے سات سے (۱۰)

اس وقت آصف الدولہ سن کے نہایت ناراض ہوئے اور بلا کر حیدر بیگ خان کو حکم دیا کہ ان کو قید کرو۔ اور ہمارے سامنے آج سے یہ نہ آنے پائیں۔ بموجب حکم نواب صاحب کے، حکم تعمیل ہوا۔ غرض بہت عرصے تلک قید رہے۔ جب نواب صاحب کے مصاحب نے سفارش کر کے حکم رہائی کا دلوایا، تب میر حسن نواب آصف الدولہ کے سامنے آئے۔ اس وقت ایک دوشالہ اور ایک رومال، غرض دس پارچے کا خلعت ہوا اور دربار میں آنے کی پروانگی (۱۱) ہو گئی، اس سبب سے یہ مثنوی نحس ہو گئی اور ہر ایک شخص پڑھتا ہر روز نہیں ہے۔ (۱۲)

میاں خلیق نے چند روز غزل کہی، بعد اس کے مرثیہ گوئی کرنے لگے۔ پچیس برس کا سن تھا۔ نواب بادشاہ بیگم صاحبہ زوجہ غازی الدین حیدر بادشاہ کے ملازم ہوئے۔ ہر ماہ میں نیا مرثیہ پڑھتے تھے اور صدہا آدمی ان کے سننے کے واسطے آتے تھے۔ اور سبحان علی خان کی سرکار میں بھی ملازم تھے اور ہر سرکار میں عشرۂ محرم میں مرثیہ پڑھتے تھے اور ایک مرثیہ جناب شیخ امام بخش ناسخ کو بھی دکھلایا ہے۔ وہ یہ مرثیہ ہے:

جب بانو نے اب کے علی اکبر کو رضا دی

اور میاں خلیق سے فرمایا کہ تم مرثیہ چھوڑ جاؤ اس میں بہت سی جاے نقص ہے، جلدی یہ نہیں بن سکتا ہے۔ میر خلیق نے عرض کیا کہ مجھ کو دو چار دن کے [بعد] مرثیہ پڑھنا منظور ہے۔ اس وقت یہ مصرع اس مرثیے میں شیخ صاحب نے بنا دیا۔ وہ بیت یہ ہے:

بیت: پیارے میرے اللہ نگہبان تمھارا

عارضۂ پیچش میں انتقال کیا۔ پل آہنی [کے] قریب ایک مسجد ہے، اس میں دفن ہیں۔ محرم میں میر انیس (۱۳) مرثیہ دس روز پڑھتے تھے۔ فقط

شہیدی: (۱۴)

تخلص شہید، مولوی حاجی فخر الدین حسن خان مرحوم، اصل وطن ان کا شاہجہاں پور تھا مگر گردش فلک سے شاہجہاں آباد میں آباد ہوئے تھے اور بوجہ روزگار کے سکونت اختیار کی تھی۔ فارسی انشا میں یکتاے زمانہ تھے۔ مرزا طاہر وحید کے طرز پر تحریر کرتے تھے۔ چند روز سر شتہ دارالانشا سرکار شاہی ان کے اختیار میں رہا۔ بڑے درویش ذی کمال تھے۔

صاحب مروت، ذی اخلاق مرد مسلمان تھے۔ ان کے شاگرد شاہجہاں پور میں اور شاہجہاں آباد میں بہت سے ہیں۔ چند شاگرد انشا پردازی میں کامل ہیں اور لوگ شعر گوئی میں نہایت مشتاق ہیں۔ ان کو شعر گوئی کا شوق چالیس برس کے سن میں ہوا تھا۔ آدمی نہایت ذی علم تھے اس وجہ سے کسی استاد کے شاگرد نہ ہوئے اور نہ اپنی غزل کسی کو دکھلائی، نہ کسی سے اصلاح لی، طبع زاد شاعری تھی۔ زور علم سے کوئی عیب ان کے کلام میں نہیں رہتا تھا۔ آپ اپنے کلام پر اصلاح کرتے تھے۔

یہی حال انشا گوئی میں تھا۔ عبارت نہایت رنگین لکھتے تھے۔ مضمون زیادہ ہوتا تھا تحریر بہت کم ہوتی تھی۔ نہایت چست بندش ہوتی تھی، کئی [کذا] زبان صاف تھی۔ طبیعت میں ایک شوخی تھی۔ کلام ان کا عاشقانہ ہوتا تھا۔

نقش خوب لکھتے تھے۔ جو شخص ان سے جس کام کے واسطے لے جاتا تھا، خدا کی عنایت سے فوراً اس کا کام ہو جاتا تھا۔ عملیات کا نہایت شوق تھا۔ ہر سال چلہ کشی کیا کرتے تھے۔ کسی شخص کے مکان [سے] کھانا نہ کھاتے تھے۔ رات دن عبادت خدا میں مصروف رہتے تھے۔ عارضہ اسہال میں انتقال کیا۔ مجموعہ سخن [۱۵] والا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ۱۲۷۸ہجری میں قریب ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا اور سخن شعرا [۱۶] والا ان کا حال تحریر کرتا ہے کہ ۱۲۸۳ہجری [۱۸۶۶۔۶۷] میں اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ ان کی یادگار سے یہ کلام موجود ہے؛ ایک دیوان اور کئی انشا فارسی میں ہیں اور وہیں دفن ہیں۔ ہر پنج شنبہ کو ان کے مزار پر چادر پھولوں کی چڑھا کرتی ہے اور صحبت گانے بجانے کی بھی رہتی اور لوگوں [کو] اکثر مراد بھی ملتی ہے۔ فقط۔

ضمیر:

تخلص ضمیر، میر مظفر حسین، خلف میر قادر علی، شاگرد غلام ہمدانی تخلص مصحفی، باشندۂ لکھنؤ محلہ نواب گنج، متصل مکان صمصام الدولہ بہادر، برادر نواب نادر مرزا صاحب مرحوم۔ بزرگ ان کے قدیم رہنے والے نجف اشرف کے تھے جہاں حضرت علیؓ دفن ہیں۔ بادشاہ عالمگیر ثانی کے زمانے میں دہلی میں تشریف لائے تھے۔ قریب لاہوری دروازے کے مقیم ہوئے۔ صوبے دار دکھن کے ہوئے۔ بہت عرصے تک اس علاقے میں رہے۔ وہی عہدہ ان کے خاندان میں چلا گیا ایک مدت تک۔

زمانے نواب شجاع الدولہ بہادر مرحوم کے، فیض آباد میں آئے۔ ان کے والد نے نواب صاحب کو عرض کی کہ ہمارے بزرگ اس سرکار فیض آثار کے قدیم نمک خوار ہیں۔ حضور کا فیض سن کے مع عیال و اطفال حاضر ہوئے ہیں۔ اس وقت میں سوائے آپ کی سرکار کے کہاں جائیں۔ اس وقت ان کی عرضی پر یہ مضمون دست خط ہوا کہ اگر آپ کو منظور ہو تو ایک رسالداری خالی ہے، کر لیجیے۔ ان کے والد مرحوم نے منظور کیا۔ سرکار سے خلعت رسالداری کا ہو گیا۔ کارِ سرکار بدستور کرنے لگے تو ان کے دوستوں نے ایک دن یہ کہا کہ میر صاحب ایک مکان یہاں بنائیے، سرکاری مکان میں کب تک گزر کیجیے

گا۔ اس وقت انھوں نے ایک عمدہ مکان تعمیر کیا۔ نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم کے ساتھ لکھنؤ میں تشریف لائے، اس روز سے باشندۂ لکھنؤ مشہور ہوئے۔

نواب سعادت علی خان مرحوم کے زمانے میں میر ضمیر صاحب پیدا ہوئے۔ سولہ برس تک علم حاصل کیا۔ بیس برس کے سن میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ زمانہ سودا اور میر حسن، میر محمد تقی، مرزا تقی ہوس کا تھا۔ یہ اس زمانے میں میاں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ان سب مصاحبوں کے ساتھ مشاعرے کرتے تھے۔ اس وقت کے شاعروں کا یہ دستور تھا کہ ڈنڈوں(۱۷) پر شعر پڑھتے تھے سر بازار۔ جس طرح ہولی میں سوانگ کے ساتھ اب تک لوگ شعر پڑھتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ایک شاعر کی ایک شاعر ہی ہجو پڑھتا تھا اور شرم و حیا کسی کی آنکھ میں نہ تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر ضمیر نے شعر گوئی کو ترک کیا اور مرثیہ گوئی کی طرف مخاتب [مخاطب / راغب؟] ہوئے۔ پہلے تو سلام سو دو سو کے مرتب فرمائے۔ جب اس سے فارغ ہوئے، تب مرثیے تصنیف بہت سے کیے۔

اس زمانے میں نواب میر اکرام اللہ خان مرحوم کے امام باڑے میں مجلس ہوتی تھی؛ نہایت عمدہ۔ لوگوں نے نواب صاحب مرحوم سے ان کی تعریف کر کے کہا کہ حضور میر ضمیر صاحب مرثیہ خوب فرماتے ہیں اور نہایت اچھا پڑھتے ہیں۔ نواب مرحوم نے یہ کلمہ سن کے میر صاحب کو طلب کیا کہ یہ اپنے مکان سے مع شاگرد، مجلس امام حسین علیہم السلام میں تشریف لائیں۔ نواب صاحب نے نہایت خاطر کی۔ اس قدر لوگوں کو ان کے سننے کا اشتیاق تھا کہ کار ضروری چھوڑ کر آئے تھے اور اس طرح کا امام باڑے میں مجمع تھا کہ لوگوں کو کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ دوپہر دن کو یہ منبر پر مرثیہ پڑھنے کو گئے تھے۔ وہ مرثیہ یہ تھا:

جب مشک بھر کر نہر سے عباس غازی گھر چلے

پہلے تو مرثیے کا چہرہ پڑھا، بعد چہرے کے لڑائی پڑھی، بعد لڑائی کے شہادت پڑھی۔ اس قدر لوگ خوش ہوئے کہ ایک عالم کی شاعری بھول گئے اور یک قلم خاص و عام ان کی تعریف کرتے تھے۔ تین گھڑی(۱۸) کے زمانے تک منبر پر مرثیہ پڑھا، جب منبر پر سے یہ اترے تو ہر خاص و عام نے ان کے ہاتھ چوم لیے اور ان کے قدم کو آنکھوں سے لگایا۔ جب رونے سے نواب اکرام اللہ خان فارغ ہوئے، اس وقت ضمیر کو سترہ پارچے کا خلعت عنایت ہوا اور دو ہزار روپیا نقد۔ اس امام باڑے میں یہ مقرر ہو گئے اور تنخواہ بھی پچاس روپیا ماہواری کی مقرر ہوئی۔ ان کی مرثیہ خوانی کی تمام شہر میں اس دن سے دھوم ہوئی۔

مرزا دبیر اس زمانے میں سلام لکھتے تھے اور شاگرد میاں دلگیر مرثیہ گو کے تھے۔ یہ شہرت مرزا مذکور میاں ضمیر صاحب کی سن کے شاگرد ہوئے۔ عرصے تک ان کو مرثیہ دکھلایا۔ جب کلام ان کا اچھا ہونے لگا تو میر باقر سوداگر کے امام باڑے میں یہ مرثیہ پڑھنے پر مقرر ہوئے ہر ماہ کی پچیس تاریخ کو۔ جب ماہ محرم ہوا، تب میر باقر مرحوم نے نواب بادشاہ محل صاحبہ سے سرکار میں اور نواب قدسیہ محل صاحبہ سے عرض کیا اور سبحان علی خان صاحب کمبوہ کی سرکار میں اور راجا میوہ رام

خطاب افتخار الدولہ بہادر سے ان کے مرثیے کی تعریف فرمائی۔ یہ سن کے راجا میوہ رام صاحب مرحوم نے طلب فرمایا اور وہ مجلس میاں ضمیر صاحب کے پڑھنے کی تھی اور ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سوز خوان مرثیہ پڑھ چکے تو مرزا دبیر صاحب کو جناب راجا صاحب نے حکم دیا مرثیہ پڑھنے کا۔ اس وقت میر ضمیر صاحب اپنے دل میں نہایت مرزا مذکور سے خفا ہوئے۔ یہ جب منبر پر گئے تو ان کے کان میں استاد نے ان کے، یہ کلمہ آہستہ سے کہا کہ تم آج سلام پڑھنا، یہ مجلس میرے پڑھنے کی ہے۔ مرزا دبیر نے عرض کیا کہ اگر اہل مجلس مجھ سے مرثیہ پڑھوائیں گے تو میں مرثیہ پڑھوں گا، اگر نہ پڑھائیں گے تو سلام پر ختم کروں گا۔ یہ کہ کر مرثیہ شروع کر دیا۔

جب دولتِ اولادِ شہِ دیں نے لٹادی

نہایت ان کے مرثیے نے لطف اہل مجلس کو دکھلایا۔ دو گھڑی تک مرثیہ پڑھا۔ جب فراغت پائی تو منبر پر سے اتر آئے تو تب نہایت میر ضمیر کو رنج حاصل ہوا۔ اس وقت راجا میوہ رام صاحب نے میر صاحب سے ارشاد فرمایا۔ میر ضمیر صاحب نے انکار کیا کہ میرے مرثیہ پڑھنے کی کچھ ضرور نہیں، مرزا صاحب نہایت عمدہ مرثیہ پڑھ چکے ہیں۔ یہ سن کے مداح نے فرمایا۔ حقیقت میں آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں مگر چند کلمے برائے ثواب آپ بھی ارشاد فرمائیں۔ آخرش ناچار ہو کر یہ منبر پر گئے اور زبان مبارک سے چند کلمے حدیث کے پڑھے۔ روتے روتے تمام مجلس بے ہوش ہو گئی اور منبر پر سے اتر آئے۔ اس وقت ان کو بیس پارچے کا خلعت اور تین ہزار روپیا نقد عنایت ہوا۔ صبح کو مرزا دبیر صاحب [نے] پانچ اشرفی نذر ضمیر صاحب کو جا کر دیں۔ میر صاحب نے نہ منظور کیں اور کہا کہ تم کو شاگردی کی کیا حاجت ہے۔ اب یہاں تشریف نہ لائیے گا۔ اس دن سے ایک ان کو رنج رہا۔[۱۹]

محمد علی بادشاہ کے زمانے میں یہ سو روپے کی ماہواری کے ملازم ہوئے۔ بیٹا کوئی نہ تھا۔ ایک بیٹی تھی؛ اس کی شادی نہایت دھوم سے کی جس طرح لوگ بیٹی کی شادی کرتے ہیں۔ عارضۂ بخار میں چند عرصے کے بعد انتقال کیا۔ دفن کربلا میں ہیں۔ ان کی یادگار سے یہ کلام موجود ہیں؛ ایک دیوان اور دو مثنوی، ایک واسوخت، تاریخ اور قطعہ، رباعی، سلام، مخمس، گرہ بند اور مرثیہ عمدہ۔

غزل

کیا کہوں میں کہ اب کہاں ہے دل
اس گلی میں رواں دواں ہے دل

گاہ پہلو میں، گاہ یار کے پاس
دیکھیو تو کہاں کہاں ہے دل

دیکھنا عاشقوں کی ارزانی
ایک بوسے پہ بھی گراں ہے دل

ہائے بے رحم اسے اٹھاتا جا
خاک اور خون میں طپاں[۲۰] ہے دل
اس قدر اس پہ رکھ نہ بار فراق
ناتوانوں کا ناتواں ہے دل
فقط۔

ظریف:

تخلص ظریف، لالہ بنی پرشاد، قوم کائستھ، ولد روشن لال، شاگرد میاں ہمدانی تخلص مصحفی، برادر ان کے چنی لال حریف، باشندۂ لکھنؤ، محلہ اشرف آباد۔ ان کے بزرگ رہنے والے دکھنی [دکھن کے] تھے۔ زمانے بادشاہ اکبر کے، دہلی میں آئے تھے، متصل جامع مسجد کے مقیم ہوئے۔ چند روز امیدوار سرکار میں روزگار کے رہے۔ بعد تھوڑے عرصے کے فوج بادشاہ کے بخشی ہوئے، ہزار ہا روپیا پیدا کیا اور عمارت نہایت عمدہ بنوائی۔ کون رسالدار اور کون داروغہ ان کے مکان پر تشریف نہیں لاتا تھا۔ ایک زمانہ ان کا تھا۔ آدمی یہ نہایت صاحب اخلاق تھے۔ ہر ایک شخص کی خاطر کرتے تھے، صدہا لوگوں کو نوکر سرکار میں کرادیا اور صدہا کے ساتھ اپنے پاس سے سلوک کیا۔ جب سرکار کو کمی فوج کی منظور ہوتی تھی یہ سرکار کو اس مضمون کی عرضی کرتے تھے کہ حضور کی فوج نہایت کم ہے۔ اور سرکار کی نسبت بہت کم ہے۔ اگر اس میں بھی فوج کم ہوگئی تو دو باتوں کا اندیشہ ہے۔ اگر کوئی کسی سے لڑائی درپیش ہوئی اور فوج کی برائے مدد سرکار سے طلب ہوئی تو بروقت فوج تیار نہیں ہوسکتی ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زیادہ فوج سے دشمن پر رعب غالب رہتا ہے۔ اس صورت سے فوج کو ہر سال بڑھاتے تھے۔ تمام فوج ان سے خوش تھی۔ اس سرکار میں نہایت ہی یہ نیک نام مشہور تھے۔

اسی صورت سے ان کے خاندان میں یہ عہدہ بدستور چلا آیا۔ ان کے دادا ساتھ آئے تھے نواب شجاع الدولہ بہادر کے۔ دہلی سے فیض آباد میں آئے۔ گلاب باڑے میں ایک مکان نہایت عمدہ تیار کیا اور ملازم نواب صاحب کے ہوئے۔ دوسو روپے کی ماہواری مقرر ہوئی۔ جب نواب صاحب برائے مدد نواب قاسم علی خان کے گئے تھے؛ یہ فوج کے ہمراہ موجود تھے۔ جب نواب قاسم علی خان کو یہ خبر ہوئی کہ نواب شجاع الدولہ بہادر تشریف لاتے ہیں، اس وقت نواب صاحب مع فوج اور جلوس شاہی سے ان کی پیشوائی کی خاطر خود گئے تھے اور راہ میں جاکر ملاقات کی۔ اپنے ہمراہ نواب صاحب کو اپنے خیمے میں لاکر اتارا اور اپنی مصیبت کا حال تمام وکمال بیان کیا تو نواب صاحب نے تسلی دی۔ مال واسباب نواب قاسم علی خان کا دیکھ کر دل میں بدی آگئی، کمر سے چھرا نکال کر نواب قاسم علی خان کو مار ڈالا اور مال واسباب ان کا لے کر اور ان کی فوج کی دونی تنخواہ کر کے طرف فیض آباد کے روانہ ہوئے، چند عرصے میں اپنے شہر میں داخل ہوئے۔[۲۱] ان کے ہمراہ جس قدر لوگ تھے وہ سب نہایت مال دار ہوگئے۔

تھوڑے عرصے کے بعد ان کے دادا نے عارضۂ سرسام میں انتقال کیا، اس عہدے پر ان کے والد مقرر ہوئے۔ کام سرکار کے [کا] ساتھ نیک نامی کے کیا اور سخی نہایت تھے۔ ہر شخص کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔ جب انتقال نواب صاحب نے فرمایا اور نواب آصف الدولہ بہادر تخت نشین ہوئے، چند روز فیض آباد میں رہے۔ بعد لکھنؤ میں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کے والد بھی آئے تھے اور بود و باش لکھنؤ میں اختیار کی۔ شادی لالہ بنی پرشاد کی بہت دھوم سے [ہوئی]۔ کئی ہزار روپیا صرف ہوا اور جوڑے ہر ایک شخص کو دیے اور برادری کو روٹی خوب دی۔ اب تلک جو اس زمانے کے آدمی زندہ ہیں، وہ تعریف کرتے ہیں۔

پندرہ برس تک تو یہ پڑھتے رہے اور سترہ برس کے سن میں ملازم سرکار ہوئے اور بیس برس کے سن میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ میاں مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ علم عروض پہلے تو پڑھا، بعد اس کے غزل تصنیف کرنے لگے۔ جب عمدہ غزل کہنے لگے، تب میاں مصحفی کے ساتھ مشاعروں میں جانے لگے اور نامی یہ شاعر ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سے یہ چیزیں یادگار زمانہ ہیں، شعر اچھا کہتے تھے، کلام میں مزا ہے: ایک دیوان، دو واسوخت، ایک مثنوی، قطعہ و تاریخ و رباعی۔

غزل

تیرے عشق میں اے بت مہ لقا، گئی مفت میں ساری مشقت دل
رہا مورد رنج و الم ہی سدا، ہوئی شاد کہیں نہ طبیعت دل[۲۲]
ہے ظریف کو تجھ سے ہی چشم وفا، کوئی اور بھی اس کا ہے تیرے سوا
میری جان جو تو نہ سنے تو بھلا کہے جا کے وہ کس سے مصیبتِ دل

فقط۔

عاقل:

تخلص عاقل، منور خان مرحوم، قوم پٹھان یوسف زئی ولایت ولد صلابت خان، شاگرد غلام ہمدانی تخلص مصحفی جگت استاد، سکونت لکھنؤ۔ پہلے ان کے بزرگ رسالدار دہلی میں تھے، زمانے محمد شاہ بادشاہ کے عرف رنگیلے شاہ۔ یہ جوان نہایت جری اور بہادر تھے۔ جہاں سرکار پادشاہ میں اور دس بیس رسالدار تھے، ان میں ایک یہ بھی تھے۔ جس مقام پر لڑائی سخت مشکل کی پڑتی تھی، وہاں ان کا رسالہ جاتا تھا۔ ایک دم میں وہ گڑھی فتح ہو جاتی تھی۔ ان کے خاندان میں یہ عہدۂ رسالداری بدستور چلا آتا ہے۔ جب زمانہ اکبر باشاہ کا ہوا اور بادشاہ ممدوح نے سکونت اکبر آباد میں اختیار کی، عرف آگرہ، تو ان کے پر دادا ملازم باشاہ کے تھے۔

ایک زمیندار نہایت بہادر تھا۔ کسی بادشاہ کو ایک کلیچہ[۲۳] کسی سال میں نہ دیتا تھا۔ ہاں یہ بات اس کی تھی، جہاں لڑائی درپیش ہوتی تھی مع اپنی فوج، شریکِ فوج سلطانی ہو کر زمیندار سے لڑتا تھا۔ جب وہ لڑائی فتح ہو جاتی تھی، اپنے شہر میں چلا [جاتا] تھا۔ اس کی خبر بادشاہ کو ہمیشہ ہوا کرتی تھی اور ملاقات نہ کرتا تھا۔ اس کی فکر ہر بات میں والی ملک کو رہتی تھی کہ

کیونکر اس کو گرفتار کریں۔ ایک روز اکبر بادشاہ نے اپنے دل میں یہ مضمون سوچا کہ ایک خط لکھ کر اس کو بلایا چاہیے۔ جب وہ مکان میں آجائے گا، اس وقت گرفتار کر کے جیل خانے میں بھیج دیں گے۔ اور زمینداروں کو عبرت ہو جائے گی۔ ایک نامہ بادشاہ [نے] اس کے نام اس مضمون کا لکھا کہ ہم تمھاری ملاقات کے نہایت مشتاق ہیں اور جائے تعجب ہے کہ تم کہیں اس طرف نہیں آتے ہو۔ ہمیشہ ہم سنتے ہیں کہ تم لڑائی میں دشمن ہمارے سے، ہماری طرف سے لڑتے ہو اور بعد فتح اپنے مکان پر چلے جاتے ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارے رفقا میں رہا کرو۔ جب یہ نامۂ محبت بادشاہ کا اس زمیندار کے پاس گیا۔ فوراً وہ حاضر حضور ہوا، بادشاہ کو نذر دی۔ حکم درپردہ شاہ نے اپنی فوج کو دیا کہ جلد گرفتار کرو، یہ جانے نہ پائے۔ جب اس شخص کو یہ بات ظاہر ہوئی کہ بادشاہ کو قید کرنا منظور ہے؛ اس وقت ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ خداوند نعمت آپ کو یہ امر مناسب نہیں ہے۔ ایک ادنیٰ آدمی کے مکان میں جو شخص آتا ہے وہ ایسی بات اس کے ساتھ نہیں کرتا۔ آپ تو بادشاہ ہیں۔ خانہ زاد کے پاس ایک گھوڑی ہے وہ سو کوس پر جا کر دم لیتی ہے۔ آپ کی فوج مجھ کو گرفتار نہیں کر سکتی ہے۔ یہ کہ کر قلعے پر سے کود پڑا، دونوں پاؤں اس کے ٹوٹ گئے۔ اب تک زیر قلعہ اس زمیندار کی قبر بنی ہوئی ہے اور پاس اس کے اسی گھوڑی کی تصویر موجود ہے۔ بادشاہ نے نہایت دل میں رنج کیا۔

منور خان عاقل کو اس سن میں تین شوق ہوئے۔ اول تو گھوڑے پر خوب چڑھتے تھے اور بندوق او سیر [۲۴] سے عمدہ لگاتے تھے اور دوسرا لکڑی کی کسرت [۲۵] نہایت اچھی کرتے تھے، اس فن میں ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ تیسرا شعر گوئی کا جب شوق ہوا تب اس قدر محنت کر کے چند عرصے میں استاد مشہور ہوئے۔ میاں مصحفی کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ فقیر محمد خان رسالدار نہایت قدردان تھے۔ ایک دن ان سے فرمایا کہ خان صاحب اگر نان خشک منظور ہو تو میں حاضر ہوں۔ تیس روپے کے آپ سواروں میں بادشاہ کے ملازم ہو۔ اس [طرح] اوقات آپ بسر کرتے ہیں، ان سے تو میں زیادہ دے سکتا ہوں۔ اس وقت منور خان نے عرض کیا کہ میں ملازم سرکار ہوں، ایک شخص دو آدمی کی نوکری نہیں کر سکتا ہے اور میں یوں ہی تابعدار ہوں۔ جس کام کو آپ فرمائیں تو اس کو سر آنکھوں سے بجالاؤں۔

زمانۂ نصیر الدین حیدر بادشاہ میں نواب حکیم مہدی نے فوج سلطانی کا جب ملاحظہ کیا تو بہت لوگوں کو برطرف کر دیا۔ ان لوگوں کے ساتھ یہ بھی موقوف ہو گئے۔ اس دن سے فقیر محمد خان رسالدار کے رفقا میں رہنے لگے۔ شعر یہ اچھا کہتے تھے۔ طبیعت عاشقانہ تھی۔ جب بیمار ہوئے تو خان صاحب نے دوا کی مگر کسی طرح بخار نہ گیا۔ آخر اسی عارضے میں انتقال کیا۔ ان کی یادگار میں سے یہ کلام موجود ہے: ایک دیوان، دوسرا دفتر پریشان و واسوخت، مثنوی، تاریخ، رباعی۔ فقط۔

موجی:

موجی تخلص، لالہ موجی رام مرحوم، کائستھ ولد لالہ دیوان چھپر پت [۲۶]، شاگرد مصحفی غلام ہمدانی، ساکن لکھنؤ محلہ تازی خانہ، [۲۷] نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم۔ بزرگ ان کے شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور عہدۂ دیوانی ان

کے خاندان میں چلا آتا ہے۔ نواب سعادت علی خان امین الدولہ بہادر کے زمانے میں ان کے والد لکھنؤ میں فیض آباد سے آئے تھے اور ان کا سن اس زمانے میں دس برس کا تھا۔ یہ مادھو رام پڑھتے تھے۔ انیس برس کے سن میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ آدمی ذی علم تھے اور نہایت طبیعت دار تھے۔ جب دو چار غزلیں تصنیف فرمائیں تو ان کے دوستوں نے کہا کہ اب تم غزل کسی استاد کو دکھلایا کرو، بے شاگرد ہوئے شعر کہنا کبھی نہ آئے گا۔ ان کے ایک عزیزوں میں تھے۔ وہ شاگرد میاں مصحفی کے تھے اور تخلص حیران (۲۸) کرتے تھے۔ وہ ان کو اپنے ساتھ میاں مصحفی کے مکان پر لے گئے، تعریف کی، ان سے کچھ ان کا کلام پڑھوایا۔ میاں صاحب نے سن کے تعریف کی اور ایک غزل پر اس دن اصلاح فرمائی۔ کئی شعر ان کے کاٹ دیے اور کئی شعر پر صواد بنایا۔ (۲۹) اب یہ روز ان کے مکان جانے لگے اور ایک یا دو غزلوں پر اصلاح روز ہونے لگی۔ چند عرصے میں یہ صاحب دیوان ہو گئے اور غزل پر اصلاح کا طریقہ خوب یاد ہو گیا۔ میاں مصحفی کے ساتھ مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ اکثر ان کی غزل مشاعرے میں رنگ دیتی تھی۔ بہت عمدہ لکھتے تھے اور اہل جلسہ ان کی تعریف فرماتے تھے۔ بعد دس پانچ برس کے میاں صاحب نے حکم شاگردوں کو فرمایا کہ لالہ موجی رام کو اپنی غزل دکھلایا کرو۔ بہت شاگرد میاں مصحفی کے ان کے پاس آنے لگے اور یہ ان کی غزلیں نہایت دل لگا کر بنانے لگے۔ اس زمانے میں اور بھی لوگ ان کے شاگرد ہوئے۔ یہ ہمعصر منشی مظفر علی اسیر (۳۰) کے ہیں اور مولوی فرد [؟] صاحب مرحوم کے یہ دوستوں میں مشہور تھے۔ امیر لوگ ان کی نہایت خاطر کرتے تھے۔

بہاء الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے اور ہر طرح کا [اختیار] ان کو اس سرکار میں حاصل ہوا۔ بے ان کے حکم، کوئی کام نہ نکلتا تھا۔ جس کو چاہتے تھے نوکر رکھ لیتے تھے، جس کو چاہتے تھے برطرف کر دیتے تھے۔ ایک زمانہ ان کا اس سرکار میں تھا۔ اپنے عزیزوں سے نہایت سلوک کرتے تھے۔ صدہا لوگوں کو رکھوا دیا اور بہت لوگوں کو اپنے پاس سے نقد روپیا [دیا] اور اپنے شاگردوں سے بہت اچھی طرح سے پیش آتے تھے۔ جب بہاء الدولہ بہادر نے عارضۂ اسہال میں انتقال کیا، چند عرصے تک یہ ان کے صاحبزادے کے ملازم [رہے]۔ جب لالہ موجی رام نے دیکھا وہ قدر میری اب اس سرکار میں نہیں رہی، خود روزگار چھوڑ دیا اور خانہ نشیں ہو کر اپنے مکان میں بیٹھ رہے۔ پھر کسی سرکار میں روزگار نہ کیا۔ اس قدر روپیا پیدا کیا تھا، ان کی زندگی بہت اچھی طرح سے بسر ہو جاتی مگر اس انقلاب کا خدا برا کرے، جس قدر مال و اسباب تھا، لوٹا گیا، ایک ایک کوڑی کو حیران ہو گئے۔ اسی غم میں آنکھیں جاتی رہیں۔ کوئی اولاد نہ تھی کہ روٹی ساتھ آرام کے اس وقت میں دیتا۔ ان کے ایک شاگرد تھے، دیا کرشن، قوم کائستھ، تخلص ریحان کرتے تھے۔ وہ زمانۂ شاہی میں راجا لال جی و گولا جی [؟] بخشی فوج سلطانی کے تھے۔ (۳۱) ان کے بڑے بیٹے بخشی الفت رائے، تخلص الفت کرتے تھے۔ ان کی سرکار میں یہ منشی خاص تھے۔ ہزار ہا روپیا پیدا کیا اور دوستوں کو کھلا دیا۔ اب تک ان کی طبیعت کا وہی حال ہے اور شاعر بہت اچھے ہیں۔ زبان نہایت صاف ہے۔ ایسا کوئی شاگرد لالہ موجی رام کا نہیں ہے۔ ان سے ان کا نام روشن ہے۔ جب میاں ریحان کو لالہ موجی رام کی تکلیف کا حال ظاہر ہوا، یہ اپنے [گھر] بیگم گنج میں جا کر لے آئے اور ہر طرح کی خاطر ہر روز کرتے تھے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے باپ کی خاطر

کرتا ہے۔ جو کچھ ان کا کلام تھا، میاں ریحان کے پاس موجود ہے۔ دو دیوان، ایک مثنوی، ایک تذکرہ، رباعی، قطعہ تاریخ ان سے یادگار ہے۔ ان کے اشعار نہایت عمدہ ہوتے تھے۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا اور بڑے زود گو تھے۔ غزل سیر ان کی ہوتی تھی۔ ۱۲۸۴ ہجری [۱۸۶۷-۶۸] میں عارضۂ بخار میں انتقال کیا۔ ان کا کریا اور کرم میاں ریحان نے کیا، بجائے اپنے باپ کے۔

غزل

ہوا ہے فیصلہ گر نقدِ جان و دل پہ قسمت کا
نہایت ہو گیا کم نرخ سودائے محبت کا
نہیں شبنم ،عرق ہے عارض گل پر ندامت کا
صبا نے ذکر چھیڑا کس گل رعنا کی رنگت کا
بتانِ شوخ کا جلوہ جو دیکھے چشم حق بیں سے
روا رکھے مسلماں پوجنا پتھر کی مورت کا
صدائے صور ہو کیوں کر نہ میرا نالۂ موزوں
کسی کے مصرعِ قد نے دیا فقرہ قیامت کا
نہ پایا نقد دل سینے میں جب دی جانِ زار اس کو
تہی دستی میں بھی میں نے کیا ہے کام ہمت کا
لڑائے آنکھ وہ اپنے جنگجو مژگاں کی پلٹن سے
بنائے چاک دل سے پہلے جو کوچہ صلابت کا
نہ نکلی جان تن سے جو غم ابروے قاتل میں
رہا ارمان مجھ کو زیر خنجر بھی شہادت کا
محبت سے مری گردن میں تو نے ہاتھ جو ڈالا
دل دیوانہ سمجھا اے پری رو طوق منت کا
فقط۔

ہوس:

ہوس تخلص، نواب مرزا محمد تقی خان صاحب، خلف نواب میرزا علی خان صاحب، شاگرد میاں غلام ہمدانی تخلص مصحفی، ان کے دادا صاحب نواب سالار جنگ بہادر مرحوم رہنے والے بنگلہ کے تھے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر کے

ساتھ فیض آباد میں آئے تھے۔ اولاد ان کی بہت تھی اور وثیقہ بھی ان کا بہت بڑا ہے اور ان کی اولاد اس قدر ہے کہ کسی کو پانچ سو روپیا کا ماہواری ملتا ہے اور کسی کو چار سو روپیا ماہواری ملتی ہے۔ بعض ان کے عزیزوں کا چار سو روپیا مقرر ہے، بعض کو دو روپیا تک ہے اور نواب علی نقی خان خطاب حضور عالم بھی ان کی اولاد میں ہیں۔ ایک ان کے خاندان میں ادنیٰ سی صفت ہے کہ سب ان کے بھائی بند جس قدر خاص وعام ہیں اور مرد اور عورتوں میں سب [کو] گانا بجانے کا [کے] علم موسیقی میں نہایت دخل ہے۔ کتنے لوگ مرثیہ خوانی کرتے ہیں اور کرتے تھے۔

ایک نواب سلطان علی خان نامی مرثیہ خوان تھے، دوسرے نواب حسین علی خان ایسا مرثیہ پڑھتے تھے کہ امیر علی صاحب سوز خوان بھی تعریف کرتے تھے۔ اور ان کے خاندان میں تین وصف اور ہیں ایک مرغ خوب لڑاتے ہیں، کوئی اس شوق سے خالی نہیں ہے اور بٹیر بازی کرتے ہیں اور پتنگ خوب لڑاتے ہیں۔ ان کے بزرگواروں نے [ان کے بزرگوار] سو روپے اور دو سو روپے کے پیچ لڑاتے تھے۔ جو شخص پتنگ لوٹ کر لاتا تھا، پانچ روپیا اس کو انعام ملتا تھا اور پتنگ باز نوکر تھے۔ کوئی دس روپیا ماہواری کا، کوئی پندرہ روپے کا، اس طرح صدہا آدمی تھے۔ کبوتر کا جو شوق ہوا تو ہزارہا پالے کہ کسی سرکار میں اس طرح کے نہ تھے۔ غرض کس فن کا آدمی نہ تھا جو ان کا ملازم نہ تھا۔ مشاعرے ان کے مکان میں ایسے ہوتے تھے کہ آج تک سرکار بادشاہی میں نہیں ہوئے اور نہ ہوں گے اور شاعروں کو روپیا صدہا ملتا ہے و[اور] تھا اور استادوں کو خلعت عنایت ہوتا تھا اور یہ سب صاحب شاعر بھی تھے۔ لکھنؤ کی ان سے زینت تھی اور جو کچھ روشنی ہے ان لوگوں کے دم سے ہے۔ نہیں تو شہر میں چراغ نہ جلتا۔ اب بھی صدہا آدمی ان کی سرکار میں ملازم ہیں۔ فیاضی کے سبب سے نہایت قرض دار ہیں؛ کوئی دس ہزار کا، کوئی بیس ہزار کا۔ جس کا وثیقہ سوا ہے وہ پچاس ہزار روپے کے قرض دار ہیں۔ ان کے سبب سے لکھنؤ میں صدہا مہاجن امیر ہو گئے ہیں اور کوئی عزیز دار یا حاکم کسی طرح کا ہدایت کرتا ہے؛ اس کو وہ لوگ یہ اس طرح کا جواب دیتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کا فیض ہے۔

نواب مرزا محمد تقی خان نہایت ذی علم تھے اور جب تک فیض آباد میں رہے، شہر ان کے فیض سے آباد تھا۔ جب نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ میں تشریف لائے تو ان کو طلب فرمایا اور جگہ رہنے کو عنایت کی۔ نواب صاحب مرحوم نے ایک مکان بنایا، متصل معالی خان کی سرائے کے۔ اور سب اپنے عزیزوں کے مکان اس میں بنوا دیے تو ان کا مجمع ایسا تھا کہ تمام شہر کے امیر وغریب ان سے خوف کھاتے تھے، کوئی ان کے منہ پر نہ چڑھتا تھا۔ تا زمانے واجد علی بادشاہ کے یہی حال تھا۔ جب سے انگریزی ہوئی ہے، اب تین تفرق [تین تفرقہ (۳۲)] ہو گئے ہیں۔ کتنے ابھی اسی مکان میں رہتے ہیں۔ نواب صاحب نے عارضۂ درد شکم میں انتقال کیا۔ اپنے امام باڑے میں دفن ہیں۔ شعر خوب فرماتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے یہ کلام یادگار ہیں: دو دیوان، دو واسوخت، تاریخ، مثنوی، مضمون لیلیٰ مجنوں و سلام، مرثیہ۔ فقط۔

گرم:

تخلص گرم، ناظر مظفر علی خان، ولد محمد خان، شاگرد میاں ذوق، مقیم میرٹھ، نواب عبداللہ خان برادر نواب سعد خان[۴۳] مرحوم والیٔ رام پور کہ ایک مدت سے ان کی رفاقت میں تھے۔ جب نواب صاحب نے انتقال کیا تو ان کے جس قدر رفیق تھے گردش فلک سے پریشان ہوگئے۔ ناظر صاحب گو نواب عباس علی خان مرحوم نائب نواب محمد سعد خان کی خدمت میں رہے۔ اس طرح کی نواب صاحب نے خاطر کی کہ نواب صاحب کا رنج و الم دل میں ان کے نہ رہا۔ نہایت خوش رہتے تھے اور نواب صاحب ہر ایک طرح کا سلوک، اپنے رفیقوں سے بڑھ کر ان کے ساتھ ہر ایک طرح کی مروت کرتے تھے۔ کھانا نواب صاحب کے دستر خوان پر دونوں وقت کھاتے تھے اور کپڑا بھی ملتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا کام ان کے حوالے تھا اور مصاحب بھی تھے۔ چند عرصے میں ہر طرح کا اختیار حاصل ہوگیا۔ آدمی نہایت نیک تھے اور ذی علم تھے اور سپاہی بہت اچھے تھے، لکڑی کی کسرت خوب جانتے تھے، مگر مزاج میں غرور کسی طرح کا نہ تھا۔ ہر ایک شخص کے ساتھ محبت کی باتوں سے پیش آتے تھے۔

جب نواب عباس علی خان نے انتقال کیا، چند عرصے تک مقیم رہے۔ بعد تھوڑے عرصے میں [کے] نواب مہدی علی خان نے بلا بھیجا کہ نان خشک اگر منظور ہو تو حاضر ہے۔ ناظر صاحب نے عرض کیا کہ فدوی اب اپنے وطن کو جائے گا، بہت عرصہ ہوا ہے اور کچھ گھر کی بھی خیریت کا حال نہیں معلوم ہوا اور عزیزوں کو بھی اپنے نہیں دیکھا ہے۔ ان کی محبت دل میں جوش کر رہی ہے۔ کسی جا پر دل فدوی کا نہیں لگتا ہے اور ان سب کو ایک نظر دیکھ کے چلا آؤں گا؛ اگر آب و خورش یہاں کا ہے۔ یہ کہ کر رخصت ہو کر اپنے وطن میرٹھ کو تشریف لے گئے، پھر وہاں سے نہیں آئے اور نہ کوئی خط کسی کو لکھا، صاحب دیوان ہیں، شعر ان کے نہایت پُر مضمون ہوتے ہیں اور زبان نہایت صاف ہے۔ عاشق مزاج ہیں۔ اشعار بھی عاشقانہ موزوں کرتے ہیں۔ ایک رنگ پر غزل ہوتی ہے۔ فقط۔

حوالہ جات

۱۔ زیر نظر تذکرے کے مفصل تعارف کے لیے راقم الحروف کا مضمون: ''تذکرۂ شعرائے لکھنؤ: ایک غیر مطبوعہ قلمی نسخے کی دریافت''، مشمولہ بنیاد، جلد نہم (۲۰۱۸)۔

۲۔ سعادت علی خان ناصر نے خوش معرکۂ زیبا میں مصحفی اور انشا کے درمیان معرکہ آرائی کا سبب شاہزادہ سلیمان شکوہ کی خفگی کو قرار دیا ہے اور اس واقعے کو خاصا مختلف بیان کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصحفی کو حسب مرتبہ و قابلیت قدر دانی نہ مل سکی اور اس کے نتیجے میں ان کے مزاج میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ نیز یہ کہ مصحفی کے اشعار میں کئی مقامات پر شبہات پائے جاتے ہیں۔ کہیں عین گرتا ہے تو کہیں یاے۔ جلد اول (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰)، ص ۳۴۹۔۳۷۳۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ نساخ نے یہ اشعار محض یادداشت کے زور پر لکھے ہیں۔ مصحفی کی یہ غزل ان کے دیوان سوم میں شامل ہے۔ غزل میں دوسرا شعر شامل نہیں۔ دیگر اشعار کی ترتیب اور الفاظ میں بھی اختلاف ہے۔ دیوان میں شامل اشعار اس طرح درج ہیں:

دیکھنا کیسا کہ واں در تک بھی جانا منع ہے — روزن دیوار سے آنکھیں ملانا منع ہے

یہ ستم تو موسم گل میں نہ کرائے باغباں — آشیاں بلبل کا ان روزوں جلانا منع ہے

بیٹھ کر بالیں پہ میری تو نہ روائے رشک شمع — سامنے بیمار کے آنسو بہانا منع ہے

مر گئے جب ہم تو اس نے اہل زینت سے کہا — اب ہمیں چالیس دن مہندی لگانا منع ہے

قصد کر کے جن کے ملنے کے تئیں جاتے ہیں ہم — وائے رسوائی انھیں در تک بھی آنا منع ہے

سادگی پر جن کی جی لوٹے ہے اپنا مصحفی — ہائے ان کو اب تلک مسّی لگانا منع ہے

کلیاتِ مصحفی، جلد سوم، تصحیح نثار احمد فاروقی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۴ء)، ص ۲۱۷۔

(۴)۔ معاصر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انشا اپنے ہم عصروں پر اعتراضات اور طعن و تشنیع بہت کرتے تھے اور ان کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ تاہم زبان دانی، حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی میں بے مثل تھے۔ محمد انصار اللہ، مؤلف، جامع التذکرہ، جلد سوم (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۷)، ۳۵۸۔۶۱۔

۵۔ دانیال بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کا نام ہے مگر اس کے ایک معنی دانا، اناج اور رزق کے بھی ہیں۔

۶۔ یہ شعر کلیاتِ انشا کی دونوں دستیاب طباعتوں میں شامل نہیں۔ کلیاتِ انشاؔاللہ خان (لکھنؤ: منشی نول کشور، فروری، ۱۸۷۶)؛ کلیاتِ انشاؔاللہ خان، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۹)۔

۷۔ اس نام سے ملتا جلتا ایک محلہ بنتھرا اب بھی لکھنؤ میں موجود ہے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اسی محلے کا نام ہے یا کسی اور قدیم محلے کا جو اب ناپید ہے۔ کسی اور تذکرے میں میر حسن کے حالات میں محلے کا نام نہیں ملتا۔ محمد انصار اللہ، ۱۱۹۔۲۲۔

۸۔ نساخ نے یہاں سہواً میر حسن کے بجائے خلیق کا نام لکھ دیا ہے۔ یہ مثنوی جو مثنوی سحر البیان کے نام سے مشہور ہے، خلیق کی نہیں بلکہ ان کے والد میر حسن کی ہے۔ متن کا سیاق ظاہر کرتا ہے کہ میر حسن ہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ اگلے اقتباس میں بھی میر حسن ہی سے مثنوی کو منسوب کیا گیا ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ یہاں سہواً خلیق کا نام لکھ دیا گیا ہے۔

۹۔ حیرت ہے کہ سیکڑوں افراد مثنوی سحر البیان پڑھ کر آوارہ مزاج ہو گئے مگر ریختی اور اس قبیل کی دوسری شاعری نے معاشرے پر کیا اثرات قائم کیے، اس کا کوئی ذکر نساخ نے نہیں کیا۔

۱۰۔ مکمل شعر یہ ہے: سخاوت یہ ادنیٰ سی ایک اس کی ہے   کہ اک دن دوشالہ دیے سات سے۔
میر غلام حسن دہلوی، سحر البیان مرتبہ رشید حسن خان (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۲۰۱۰)، ص ۱۵۸۔

۱۱۔ پروانگی کے معنی تو شیفتگی یا والہانہ پن کے ہیں اور پروانہ کرنا کے معنی ہیں حکم لے جانے کا کام یا قاصد کا کام کرنا؛ مگر یہاں مصنف نے اسے اجازت یا فرمان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

۱۲۔ آصف الدولہ کی میر حسن سے کشیدگی اور مثنوی کے منحوس ہونے کے خیال کے بارے میں کئی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں چھپنے والے ایک انتخاب، مجموعۂ سخن میں جسے بطور نصاب مرتب کیا گیا تھا، یوں لکھا گیا ہے: ''جب قصہ مثنویٔ بے نظیر کہ کر نواب آصف الدولہ بہادر کے حضور میں سنائی تب انھوں نے ایک دوشالہ ملبوس خاص عنایت فرمایا لیکن عجیب واقعہ ہوا کہ مثنوی سناتے سناتے نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں یہ مصرع نکل آیا، 'کہ اک دن دوشالے دیے سات سو' اور چوں کہ آصف الدولہ بہادر نے ایک دن میں چودہ سو دوشالے بانٹے تھے، پس یہ مصرع سن کر نہایت بد دماغ ہوئے، بلکہ مشہور ہے کہ قید بھی کیا۔ اس وجہ سے بعض لوگ مثنوی مذکور کو منحوس کہتے ہیں۔'' مرتبہ پنڈت شیونرائن، منشی محمد حکیم الدین و منشی غلام حسین (لکھنؤ، منشی نول کشور پریس، ۱۹۲۳، تیسویں اشاعت)، ۸۱۔ میر شیر علی افسوسؔ اور سعادت خان ناصرؔ نے بھی اس واقعے کا حال اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ رشید حسن خان نے مختلف بیانات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان واقعات میں صداقت کا عنصر مشکوک ہے۔ البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ آصف الدولہ نے میر حسن کو محض دوشالہ عنایت کر کے عزت افزائی تو کر دی ہو مگر انعام و اکرام سے محروم رکھا ہو جس کے نتیجے میں میر حسن مایوسی کا شکار ہو گئے ہوں۔ سحر البیان (نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۱۰)، ۴۴۔۵۱۔

۱۳۔ میر انیس کے ذکر کا یہاں محل نہیں ہے۔ غالباً میر خلیق ہی کہنا چاہتے تھے۔

۱۴۔ مصنف نے یہاں شہیدی کا عنوان دیا ہے لیکن جس ماخذ یعنی مجموعۂ سخن کا حوالہ دیا ہے اس میں شاعر کا تخلص شہید ہے شہیدی نہیں۔ ماخذ کی تفصیل کے لیے رک۔ حاشیہ ۱۴۔

۱۵۔ مجموعۂ سخن کے عنوان سے شائع ہونے والا یہ انتخاب کوئی باقاعدہ تذکرہ نہیں بلکہ نصابی مقاصد کے لیے مرتب کی گئی کتاب ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ رشید حسن خان نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۷۲ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے ہوئی۔ (سحر البیان، ص ۴۸)۔ راقم الحروف کے پیش نظر اس کی تیسویں اشاعت کا عکس ہے جو ریختہ کی ویب گاہ پر موجود ہے۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

مجموعۂ سخن، حصہ اول

مشتمل بر کلام شعرائے متقدمین و سخنوران متاخرین مع اصولِ شعر و تذکرۂ شعرا

حسب ایمائے

جناب کالن اے آوبرونگ صاحب بہادر ایم اے ڈائریکٹر سابق سررشتہ تعلیم اودھ و پنڈت شیونرائن صاحب، ڈپٹی انسپکٹر مدارس، ضلع لکھنؤ، و مولوی محمد حکیم الدین صاحب، ہیڈ ماسٹر چوک اسکول لکھنؤ، و منشی غلام حسنین صاحب قدر مرحوم، ہیڈ ماسٹر مدرسۂ مہونہ ضلع لکھنؤ و پروفیسر فارسی کیننگ کالج نے بکمال تحقیق و تفتیش اساتذہ اردو ساکن لکھنؤ و دہلی کے کلام فصاحت فرجام سے تالیف کیا اور صاحب محتشم الیہ کی سفارش سے کلکتہ یونی ورسٹی کے سینیٹ نے اردو انٹرنس کورس میں داخل کیا واسطے منفعت عام طلبہ مدارس سرکاری کے۔

تاریخ (https://www.rekhta.org/ebooks/majmua-e-sukhan-part-001-ebooks)
ملاحظہ: ۸ مئی، ۲۰۱۸ء۔

۱۶۔ نساخ نے اس تذکرے میں کئی جگہ مجموعۂ سخن اور سخن شعرا کا حوالہ دیا ہے۔ سخن شعرا نساخ کا اپنا تصنیف کردہ تذکرہ ہے جس میں شعرا کے بارے میں انتہائی مختصر معلومات درج ہیں اور زیادہ زور ان کے نمونہ کلام پر دیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں کل چھ ایسے شعرا کا ذکر ہے جن کا تخلص شہید تھا۔ ان میں سے پہلے یہی صاحب ہیں جن کے بارے میں نساخ نے کل دو سطروں میں یہ معلومات درج کی ہیں: ''شہید تخلص، مولوی حاجی فخر الدین حسن خان مرحوم، باشندۂ شاہجہان پور۔ مقیم دہلی۔ منشی دارالانشا شاہی تھے۔ گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ انتقال کیا۔'' اس کے بعد ان کے تین اشعار درج ہیں۔ مگر سخن شعرا میں یہ سنہ وفات درج نہیں ہے۔ صرف تاریخ تحریر سے گیارہ برس قبل ان کے وفات پانے کا ذکر کیا گیا ہے جس سے درست طور پر سنہ وفات کا تعین یقینی نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جس وقت مصنف نے یہ سطریں لکھی ہوں گی وہ کون سا سنہ ہجری یا عیسوی ہوگا۔ نساخ، سخن شعرا (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۲)، ۲۶۰۔

۱۷۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ فقیر اور گدا گر دو چھوٹی چھوٹی لکڑیاں دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک کو دوسری پر بجاتے پھرتے تھے اور اس ساز کے ساتھ گایا کرتے۔ شرفا کے لیے یہ بات معیوب سمجھی جاتی تھی۔

۱۸۔ دن رات کو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور اس کے ساٹھویں حصے کو گھڑی کہتے تھے۔ جو تقریباً ۲۴ منٹ پر مشتمل ہوتی۔ اصطلاحاً گھنٹے بھر کی مدت کو بھی گھڑی کہہ دیتے ہیں۔

۱۹۔ محمد حسین آزاد نے مرزا دبیر کے ذیل میں دبیر اور ضمیر کے درمیان چپقلش کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ نواب شرف الدولہ کے دربار میں میر ضمیر کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ میر ضمیر کی تعریف اور حوصلہ افزائی کے باعث دبیر کو بھی ان کی مجلس میں مرثیہ سنانے کا موقع حاصل ہو گیا تھا چنانچہ پہلے دبیر مرثیہ پڑھتے تھے اور پھر ضمیر۔ ایک مرتبہ ایسی ہی ایک مجلس میں سنانے کے لیے دبیر نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع تھا: دست خدا کا قوت بازو حسین ہے۔ ضمیر کو یہ مرثیہ بے حد پسند آیا اور انھوں نے کہا کہ اس بار نواب صاحب کی مجلس میں یہ مرثیہ وہ خود پڑھیں گے۔ دبیر نے مرثیہ استاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بعد میں لوگوں کے بھڑکانے پر مجلس کے موقع پر وہی مرثیہ پہلے خود پڑھ ڈالا۔ ضمیر بہت بددل ہوئے اور اس دن سے دونوں کے تعلق میں دراڑ پڑ گئی۔ آب حیات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰)، ۴۲۶-۲۷۔ ناصر نے اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی بیان کی ہے۔ ان کے مطابق یہ مجلس راجا میوہ رام کی تھی۔ ضمیر نے بعد از اصلاح دبیر سے یہ مرثیہ مانگ لیا تھا مگر دبیر نے اس کی ایک نقل اپنے پاس رکھی اور مجلس میں جا کر استاد سے پہلے خود وہ مرثیہ پڑھ ڈالا جس کے بعد ضمیر کے دل میں ان کی طرف سے میل آ گیا۔ خوش معرکۂ زیبا، جلد اول، ص ۵۲۳-۴۔

۲۰۔ تپاں کا متبادل املا۔ بمعنی تڑپنے والا، بے قرار، مضطرب۔

۲۱۔ یہ قصہ محض سنی سنائی کہانی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تاریخ کی کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

۲۲۔ سخن شعرا میں یہ مصرع یوں درج ہے: رہا مور درنج و الم ہی سدا، ہوئی شاد کبھی نہ طبیعت دل

۲۳۔ کلیچہ یعنی کلچہ، خمیری یا معمولی آٹے کی پھولی ہوئی روٹی۔ مراد انتہائی معمولی محصول۔

۲۴۔ احتیاط سے۔

۲۵۔ لکڑی کے ڈنڈوں کی مدد سے کئی قسم کی کسرت یا ورزش کی جاتی تھی جو اس دور کا ایک مقبول کھیل تھا اور اس کے لیے مختلف قسم کے داؤ پیچ استعمال کیے جاتے تھے۔

۲۶۔ مذکورہ متن میں یہ لفظ چھرہٹ پڑھا جاتا ہے لیکن سخن شعرا میں چھپرپت لکھا گیا ہے۔ ص ۴۶۶۔

۲۷۔ متن میں تاریخانہ درج ہے لیکن جناب انیس اشفاق (لکھنؤ) سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محلے کا نام تازی خانہ ہے اور یہ محلہ اب بھی موجود ہے۔ افتخار عارف صاحب نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

۲۸۔ حیران نام کے ایک شاعر کا تذکرہ جامع التذکرہ جلد دوم میں موجود ہے مگر وہ سرب سنگھ دیوانہ کے شاگرد تھے۔ بعد میں شیر علی افسوس سے بھی تلمذ اختیار کیا۔ ص ۲۳۳۔

۲۹۔ صواد بنانے سے مراد ہے ”ص“ کی علامت لگانا جس کا مطلب ہے صحیح۔ جس شعر کو استاد درست سمجھتے تھے اس پر یہ علامت بنا دیتے تھے۔

۳۰۔ منشی مظفر علی اسیر اس زمانے کے ایک اہم شاعر تھے مگر نساخ نے ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ دیگر شعرا کے ذیل میں البتہ کئی جگہ ان کا نام آتا تھا جس سے تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ تذکروں کے علاوہ شمس الرحمان فاروقی صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کا ذکر بالتفصیل رقم کیا ہے اور انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ”تدبیر الدولہ، مدبر الملک منشی مظفر علی اسیر“، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب، جلد ۶۰، شمارہ ۲۳۹ (جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۶): ۱۷۔۲۹۔

۳۱۔ ریحان کا ذکر سخن شعرا میں شامل نہیں ہے البتہ ناظر کاکوروی نے اپنی کتاب ہند و ادیب میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ”دیوان دیا کرشن نام۔ ریحان تخلص۔ فیض الملک راجا الفت رائے الفت کے رشتے دار تھے۔ موجی کے شاگرد تھے۔ شمس، عیش، شاداں اور رنگین سے لطف صحبت رہتا تھا۔ ۱۸۸۵ میں انتقال کیا۔ ص ۱۴۱۔ ریحان کا تذکرہ ناصر نے دو سطروں میں یوں کیا ہے: ”لالہ دیا کرشن، تخلص ریحان، خوش رو اور نوجوان، ابتدا میں مشقِ سخن رام دیال سخن سے۔ بعد اس کے موجی رام موجی نے بہ سبب قرابت کے درستی اس کے کلام کی کی۔“، خوش معرکہ زیبا، جلد اول، ص ۵۱۸۔

۳۲۔ تین تفرقہ ہونا یعنی تتر بتر ہونا۔

۳۳۔ سخن شعرا میں یہ نام نواب سعید خان (والی رام پور) ہے۔ ص ۴۰۲۔